جدید اُردو شاعری کی علامتیں نئے تناظر میں

ڈاکٹر نگہت ناہید ظفر

Abstract:

اکیسوی صدی میں عالمگیر یت (Globalisation)ایک طے شدہ حقیقیت ہے سیاسی ، معاشرتی مسائل میں مفادات اور تنازعات بھی عالمگیریت کے زمرے میں آجاتے ہیں مگر کیا یہی عالمگیریت ادب میں بھی ہے؟ کیا لاطینی امریکہ کے مسائل ۔ افریقی اور ایشائی ملکوں جیسے ہیں ؟ بھوک ،غربت ، پسماندگی ، افریقہ کے علاوہ ایشائی مما لک کا مسئلہ بھی ہے ۔خود شناسی ۔ دہشت گردی تعصب نہ صرف مشرق وسطی بلکہ جدید امریکی ویورپی زندگی میں درآنے والے مسائل ہیں۔تو کیا دنیا کا ادب ان تمام مسائل کی ترجمانی عالمگیر سطح پر کرے گا؟ کیا لاطینی امریکہ کے ادیبوں کی تخلیقات کی علامتیں اُردو کے ادیبوں سے مختلف ہوں گی یا کہ تمام زبانوں کے ادب کی علامتی کائنات بھی عالمگیر مسائل کی طرح ایک جیسی ہوں گی۔تحقیق کی اس جہت پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ علامت ہوتی کیا ہے ؟علامت جیسے انگریزی میں "Symbol" کہا جاتا ہے ۔

> "A Person, an Object, an event etc, that represents a more general quality or situation: White has always been a symbol of purity in Western cultures"1

اسی طرح انگریزی ادب میں علامت کی تعریف اس طرح کی گئی

> In the semiotics Of C.S Peirce, the term denotes a kind of "Sign" that has no natural or resembling connection with its referent, only a conventional one: this is the case with words. In literary usage, however, a symbol is a specially evocative kind of image; that is a word or phrase referring to a concrete object, scene, or action which also

has same further significance associated with it: Rose, Mountains, Birds, and Voyages have all been used as common literary symbols. 2

اُردو میں علامات کی وضاحت کشاف تنقیدی اصطلاحات میں درج فیض احمد فیض کی رائے سے بڑی درست معلوم ہوتی ہے۔

علامات سے مراد ہم ایسے استعارے مراد لیتے ہیں ۔جنہیں شاعر اپنے بنیادی تصورات کے لیے استعمال کرتا ہے ۔3

علامت کی تعریف کی وضاحت سے ایک بات تو طے ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں کے ادب میں علامتوں کا استعمال تو عالمگیر ہے مگر علامتیں عالمگیر ہیں کیونکہ ہر ملک کا کلچر اور پس منظر، اپنے جغرافیائی خط و خال میں مختلف ہوتا ہے اسی طرح آج اکیسوی صدی میں ہر ملک اور ہر

زبان کا علامتی نظام فکر ایک دوسرے سے مختلف ہے ۔

علامتی زبان کا استعمال شاعری کے لیے بہت اہم ہے کیونکہ علامتی زبان ہی شاعری کو منفرد بناتی ہے اور ایک شاعر جتنی کامیابی سے علامتوں کا استعمال کرتا ہے وہ اس کی شاعری کے تاثر کو گہرا بنا دیتی ہیں غزل میں گل و بلبل ، شمع و پروانہ ، بہارخزاں، داروسن، آشیاں وقفس، بادہ و جام کی علامتیں کلاسیکی دور سے استعمال ہوتی رہی ہیں۔ گویا فیض کے خیال میں شاعری میں ہر استعارہ ایک علامت ہے کیونکہ وہ اپنی حدود سے ماوراء ہو کر کسی پس منظر کی نشاندہی کرتا ہے ۔مگر یہ بات بھی تسلیم ہے کہ علامتیں استعمال سے اپنی اپنی حیثیت کھو دیتی ہیں۔مگر اپنی علامتیں جب بڑے شاعر کے استعمال میں آتی ہیں اور اپنے عہد کے کرب کو بیان کرتی ہیں تو وہ ان کے اندر معانی کا ایک جہاں بھر دیتے ہیں جیسے فیض نے بہاروخزاں اور دارورسن آزادی کے لیے استعمال کیا۔

اُردو کے جدید شاعروں نے بھی اپنی علامتوں میں اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر کو بیان کیا ہے اکیسویں صدی میں پاکستان کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان میں دہشت گردی اس خطے کا سب سے بڑا مسئلہ ہے جس کا پس منظر غربت ہے ۔ اگر ہم اس پس منظر میں جدید شاعروں کی علامتی فکر کو مدنظر رکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ ہی علامتیں جو ماضی میں کچھ اور تھی اب ان کا استعمال منفرد انداز سے ہوا ہے ۔

شاعری کے لیے علامتی اظہار بنیادی ضرورت بھی ہے اور خاص طور پر وہ دور جو آزادی اظہار پر بندشیں رکھے تو شاعر اپنے جذبات کے اظہار کے لیے علامتی نظام میں آسانی آسانی محسوس کرتا ہے ۔اکیسویں صدی میں اُردو شعرا نے علامتوں کو نئے معنی اور مفہوم دیئے اور اپنے معاشرے کے مسائل کو اُجاگر کیا اور اردو شاعری پر کیا گیا وہ اعتراض بھی کافی حد تک دور ہوتا دکھائی دیتا ہے کہ اُردو شاعر ایک الگ دنیا کا باسی ہوتا ہے اور حقیقی دنیا سے اس کا واسطہ بلواسطہ کے بجائے بلاواسطہ ہوتا ہے ۔شاید اسی لیے شاعری کے بارے میں پال والیری نے کہا تھا کہ

''شاعری چاہے حسیات یا جذبات سے کتنی ہی مالا مال ہو اس میں چاہے کتنی ہی وارفتگی ہو، پھر

بھی یہ ثابت کرنا آسان ہے کہ اس کا تعلق عقل کی قوتوں سے ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ اصولی طور پر ایک جذبہ ہے تو وہ جذبہ اپنی ہی قسم کا جذبہ ہوتا ہے''4

اکیسویں صدی کی برق رفتاری نے ادب اور فن کی قدروں کو کم کر دیا ہے بے ہنگام زندگی دراصل فن اور فلسفہ کی گتھیوں کو سُلجھانے کے بجائے مادی اور افادی مسائل میں اُلجھ چکی ہے۔ حدود و وسائل کی لوٹ مار کی جنگیں طویل ہوچکی ہیں۔ نفسا نفسی اور متشدد ذہنی رویے عام ہیں اور پھر ترقی پذیر ملکوں کے باسی روزی روٹی کی فکر سے آزاد ہی نہیں ہوتے تو وہ ادب وفن کی سرگرمیوں میں توجہ کیسے دیں۔ مگر اس کے باوجود معاشرے کا ایک فیصد ہی سہی ایسا طبقہ ضرور ہے جو اشیاء کی قدر و قیمت افادی پہلوؤں سے متعین نہیں کرتے بلکہ تاجرانہ نقطہ نظر ف سے ہٹ کر زندگی کا بنیادی فلسفہ۔ تصوف، اخلاقیات، انسانیات اور ادب وفن سے کرتے ہیں اگرچہ کہ ہم تہذیبی عدم توازن کا شکار ہیں مگر پھر بھی شاعر کسی نہ کسی طرح اس عدم توازن کو متوازن کرنے میں کوشاں ہیں

جدید اُردو شاعری کی جدید علامتوں کے بارے میں ڈاکٹر سہیل احمد خان نے کہا تھا

''نئے ادب میں جب یہ علامتیں استعمال ہوتی ہیں تو نئی نہیں ہوتیں۔ بلکہ پرانی علامتوں کی خاص شکل کے قریب ہوتی ہیں۔ وہ بس اسی صورت میں نئی ہوسکتی ہیں جس مفہوم میں فطرت ہر آن نئی ہوتی ہے۔ انسان علامتیں تخلیق نہیں کرتا ان کے ذریعے تبدیل ہوتا ہے، علامتیں ہم سے بڑی ہیں کیونکہ ان کے ذریعے وجود کی اعلیٰ سطوں کا ادراک کر سکتے ہیں''5

اکیسویں صدی کی کرب ناک فضا کی عکاسی جتنے کرب اور اذیت سے اُردو شاعری نے کی اس کی مثال کسی بھی زبان کے جدید ادب کے مقابلے میں دی جاسکتی ہے۔

یہ عہد اپنی تمام تر ترقی کے باوجود روح انسانی اور فطرت کے لیے موت کا سامان بھی پیش کر رہا ہے جس کی مثال نصیر احمد ناصر کی نظم ''زمین کے نام جو ابتداً تمام پانی تھی'' میں دیکھئے۔

زمین زادے!
تجھے تو کچھ دکھائی بھی نہیں دیتا
سقاوہ کب سے خالی ہے
نہ اوپر ابر باراں ہے
نہ اب زیر زمین
آبِ بقا ہے
عالمِ فطرات غائب ہے
نباتاتی تبسم کھو گیا
تابکاری خواہشوں کا بول بالا ہے۔6

آب بقا، تابکاری خواہشوں'' کی طرح بلیک ہول، بلیوں مون، لائٹ کونز، اطلانتہ جیسی منفرد علامتیں، جدید انسان

کے ان مسائل کو بیان کرتی ہے جس نے انسان کا فطرت سے تعلق ختم کر دیا ہے اور فطرت جو انسانی حیات کی بقا کا فرض انجام دیتی ہے اس کے ہاتھوں تباہ بربادی کے دہانے پر ہے گویا انسان اپنی تباہی کا سامان خود کر رہا ہے گویا نصیر احمد ناصر اپنی علامتوں میں ماحولیاتی تبدیلیاں جو اس عہد کا سب سے بڑا مسئلہ ہے ان کو پیش کرتا ہے۔

انسانی علوم کی ترقی ہمیشہ انسان کو نئی منازل کی طرف گامزن رکھتی ہے مگر یہ ترقی بعض اوقات اس کیلئے مسائل کا انبار بے پایا بھی ساتھ لاتی ہے۔ پاکستان جیسے ملک کو پچھلے چند سالوں میں، سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی اور مذہبی مسائل نے اپنی لپٹ میں لے رکھا ہے کہ ڈاکٹر خورشید رضوی جیسے شاعر بھی اپنی شاعری میں نئی علامتوں کا نئے معنی میں استعمال کرنے اور اس تہذیبی خالی پن کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں حالانکہ ڈاکٹر خورشید رضوی کلاسیکی روایتوں کے امین ہیں مگر انہوں نے ان روایتوں کو اس جدید عہد میں نئے معنی سے ہم آہنگ کیا ہے ان کی نظمیں ''زمانے'' اور ''وہ تکمیلی زمانے'' ایسی نظمیں ہیں جن میں زمانے کی علامت کو انہوں نے انسانی وجود اور اس کی خواہشات سے باندھ دیا ہے زمانے جو علامت ہے قہر اور جبر کی جس کے سامنے انسان بے بس ہے۔ بے حیثیت ہے اصل حیثیت زمانے کی ہے کہ جس کی قسم خود رب عظیم نے سورہ العصر میں کھائی ہے۔ وقت اور لمحات کہ جن پر انسان کا کوئی اختیار نہیں ''وہ تکمیلی زمانے'' کے اس حصے میں دیکھئے۔

زمانے جن میں انسان
اپنے باطن کے
گھنے سائے میں رہتا تھا۔
ارادوں کے وہ تار و پود
جن میں کتنے سالوں، کتنی صدیوں کے
نمونے بافت میں اٹھتے تھے
اور کرگھے کے اندر پاؤں کی جنبش
کسی فوری ضرورت سے بھی کبھی رکتی نہیں تھی۔7

کہا جاتا ہے کہ ہر نسل کا اپنا جمالیاتی شعور ہوتا ہے مگر نفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس دور میں حالات و واقعات اتنی تیزی سے رونما ہو رہے ہیں کہ ہم چیزوں کی معنویت کو پوری طرح گرفت میں بھی نہیں لیتے اور وہ بدل جاتی ہیں اسی طرح اس عہد میں جمالیات کے نظریات بھی بدل گئے ہیں او تخلیقی معیار بھی بدل گئے ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تخلیقی سوتے خشک ہو گئے ہیں۔ قتل و غارت اور خون ریزی کے باوجود فنکار رنگوں اور تتلیوں کی علامتوں کو استعمال کر رہے ہیں۔

ذیشان ساحل کی شاعری کو ہی لیجئے۔ ان کی شاعری کا ایک ایک لفظ اپنے عہد خاص طور پر پچھلے پچیس تیئس برسوں کے کراچی کے حالات کا توحہ ہے مگر جو علامتیں شاعر نے اس حزن و ملال کو بیان کرنے کے لئے واضع کی ہیں۔ اُن کا جمال اور تاثر اتنا انوکھا ہے کہ ادب کا قاری اس حزن و ملال اور دل میں اُٹھتے میٹھے درد کی چبھن کو محسوس

کرنے لگتا ہے۔اسد محمد خان لکھتے ہیں۔

''کئی بار ایسا ہوا کہ انہیں پڑھتے ہوئے میں نے کتاب رکھ دی اور ان کے دیئے ہوئے دھیمے اور سفاک حزن کی آنچ میں بیٹھا میں اپنے دکھ درد کے اچھے دنوں کو اور اپنے دنوں کے اچھے لوگوں کو یاد کرتا رہا ہوں۔8

ذیشان کی نظمیں نہیں بلکہ کراچی کی تاریخ ہیں وہ خود کہتے ہیں کہ ان کی یہ نظمیں کراچی کے لیے نہیں بلکہ ان تمام شہروں کے لئے ہیں جن کو کراچی جیسے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ ذیشان کی نظمیں ''ماچس کی ڈبیاں''اور''ہمارا بادشاہ'' کی علامتی فضا اتنی گھمبیر اور الم ناک ہے کہ کراچی کے تہذیبی، سیاسی، سماجی اور معاشی تباہی کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔ خاص طور پر سیاسی منافقتوں کی ترجمانی بھی اس سے بہتر نہیں ہوسکتی مگر ذیشان ساحل کا ایک کمال ہے کہ وہ اس کی شاعری کی علامتیں اتنی معصوم اور پاکیزہ ہیں کہ وہ ہمارے اندر حزن تو پیدا کرتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہمارے سماجی رویئے جو شدت کی طرف مائل ہیں ان میں متوازن احساس بھی پیدا کرتی ہیں۔

ان کی نظمیں جو اُن کے مجموعے''ای میل اور دوسری نظمیں'' میں شامل ہیں۔کمپیوٹرائیزڈ زندگی کی ترجمانی کرتی ہیں ان کی نظم''ٹائم بم'' کا یہ حصہ دیکھئے

میرے پاس ایک خواب ہے
جو کسی کو سنایا نہیں
میرے پاس ایک دل ہے
اور ایک ٹائم بم جو دل کے آس پاس
ہمیشہ ٹک ٹک کرتا رہتا ہے9

اپنے عہد کے تصادم کی فضا کی تصویر کشی اس سے بہتر کیسے ہوسکتی ہے۔خواب اور ٹائم بم، خواب دیکھنے والی آنکھوں میں جب زندگی سے مدافعت کی قوت ختم ہو جاتی ہے اور ٹوٹے خوابوں کی کراچیاں لہولہان کر دیتی ہیں تو شاید وہ معصوم دل جو امنگوں سے بھرپور تھا جو زندگی کے خوشحال وخوشنما خواب دیکھتا تھا۔ وہ خواب الاو بن کر ٹائم بم کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

جدید اردو شاعروں نے پرانی علامتوں کو بھی مرکزی حیثیت دی مگر اس کے ساتھ ساتھ نئی میٹر پولٹن زندگی کو بھی اپنی شاعری کا مرکز بنایا گلزار کی شاعری کو دیکھ لیں ایک طرف وہ''جولائے''اور''دھینے'' جیسی علامتوں کو برتتے ہیں۔ جو زندگی کے تار تار جسم کے لیے دھاگہ بن رہے ہیں اور دوسری طرف''پائنیر دس'' جیسی علامتیں جو خلا کی وسعتوں اور فاصلوں کے لئے اسی طرح''ایک پیپل تھا اور خرچی'' جیسی نظموں میں پورا تاثر ہی علامت اس کے تاثر کو قائم کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔نظم کی کامیاب فضا اس کے اندر علامتی نظام سے ہوتی ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان کی شاعری میں جدید اور روائتی علامتوں کا امتزاج ہے۔''ایک ہی موسم کے پرندے'' اور''راہ کی نشانیاں''، کہ پہلی نظم 'کیمیا گر' کیمیا گر وہ شخص ہے جو بھٹی میں آگ جلا کر چیزوں کی ماہیت ہی بدل کر رکھ

دیتا ہے کیمیا گری کا پیشہ بہت پرانا ہے ۔ دھاتوں کا سونا بنانا دراصل وجود کی پختگی کا عمل ہے شاید صوفی اور ولی بھی اس بھٹی میں جل جل کر کندن بنتے رہے اسی طرح اس عہد کے انسان کو زندگی کرنے کے لیے کن کن بھٹیوں کی آگ میں جلنا پڑتا ہے ۔آگ جو سب کچھ جلا کر کارا کھ کر دیتی ہے ۔نفرت کی آگ،تعصب کی آگ، غصے کی آگ کہ انساں کو جلا کر اپنی نفرت کی پیاس بجھانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے ۔

نظم کا یہ حصہ دیکھئے

پھیلے تھے میرے چاروں جانب:
شعلوں کے مکاں،شعلوں کے نگر
جب آگ میں جل کر آگ ہوئے
وہ آگ تھی اور نہ اس کی خبر
میری رنگت بدل گئی کیسے
تم کون تھے اب یہ راز کھلا
کس آنچ کی رہ گئی مجھ میں کمی
مرا کیمیا گر مجھے بھول گیا''10

اسی طرح آگ کی علامت کو زندگی کے جوش و جذبے کے طور پر بھی لیتے ہیں کیونکہ یہ حیات جہد مسلسل ہے اور اس کے لیے انسان کو ایک جنون کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں ، پرندے، بادل، بارش ، پانی جیسے فطری علامتیں بھی ہیں پانی جو زندگی کے لیے ضروری ہے ۔پانی سے کائنات میں طروات اور حلاوت ہے کیونکہ آگ اور پانی بظاہر متفاد لیکن اصل میں دونوں کا وجود باہم ہوتو حیات تکمیل پانی ہے ۔

فطری علامتوں میں ایوب خاور شجر کی علامت کو تاریخ کے دھاروں سے گزار کر موجودہ دور کے کرب تک لا کر چھوڑتے ہیں۔شجر کی علامت کلاسیکی عہد میں بھی موجود رہی۔ خاص طور پر ہمارے صوفیاء نے شجر کو اپنی شاعری میں نمایاں جگہ دی اور اس سے روحانی کشف بھی حاصل کیا جیسے گوتم نے شجر سے ہی نروان حاصل کیا،مگر ایوب خاور شجر کی علامت سے اس جدید عہد کے ماحولیاتی نوحے کو بیان کرتے ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں سید کاشف رضا کی ایک نظم''دھاگوں سے جڑا آدمی''کسی انوکھی علامت ہے شاعر جب کہتا ہے:

کچھ لوگ اپنے دھاگے کھینچنے لگتے ہیں
اور نہیں جانتے وہ میرے دل سے
کتنے گہرے سلے ہوئے ہیں
دھاگے ٹوٹتے جڑتے رہتے ہیں
زندگی بھر پر آدمی دھاگوں سے ٹوٹ جاتا ہے'' 11

خواتین شاعرات میں نسرین انجم بھٹی نے کچھ ایسی علامتیں وضع کیں جو اس دھرتی کے باطن سے جنم لیتی ہیں اور اس

دھرتی کی باسی عورت کے ازلی دکھوں بیان کرتی ہیں خاص طور پر ان کی نظمیں ''جونک'' اور گٹھری گیلے کپڑوں کی''

اس سے پہلے ہمارے شاعر نے جونک اور گٹھری کو زندگی کے دکھوں کے لیے علامتی انداز میں استعمال نہیں کیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اب اردو شاعری اپنی جڑوں کو پہچان گئی ہے اس نے تازگی کے لیے اپنی مٹی کے نم کو محسوس کر لیا ہے اسی لیے تمام نئے لکھنے والے اس عہد کے قصے کو نئے علامتی انداز میں نئے مفہوم میں بیان کر رہے ہیں اور جو روائتی علامتیں استعمال کر رہے ہیں وہ بھی نئے پیرائے اظہار میں کہ جدید زندگی کے علائم و رموز کی ترجمانی ہو سکے۔

حواشی:

1. Oxford Advanced Learner's Dictionary of Current English, Oxford University Press, seventh, Edition
2. Chris Baldick Oxford University Press 2008, Page 326

3۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات مرتب ابوالحجاز حفیظ صدیقی، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، 1985، ص124
4۔ محمد ہادی حسین، مترجم، مغربی شعریات، لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع دوم، جون 2005، ص270
5۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، مجموعہ سہیل احمد خان، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، 2009، ص۔14
6۔ نصیر احمد ناصر، عرا بچی سو گیا ہے، لاہور۔ تسطیر پبلشرز، 2002 ص5
7۔ خورشید رضوی، ڈاکٹر، دیریاب، لاہور، القا پبلیکیشنز، 2012، ص91
8۔ ذیشان ساحل، ساری نظمیں، کراچی، آج کی کتابیں 2011 م ص573
9۔ ایضاً ص489
10۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر راہ کی نشانیاں، لاہور قوسین، 2001، ص12
11۔ سویرا لاہور، شمارہ، 13، جلد 9، قوسین